ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.3 (2026)
(July to September)

اُردو افسانے میں مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیہ: جنس، شناخت اور مزاحمت

Postcolonial Feminist Discourse in the Urdu Short Story: Gender, Identity and Resistance

ڈاکٹر سید زاہد حسین کاظمی

وائس پرنسپل، اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبا، اسلام آباد

Dr. Syed Zahid Hussain Kazmi

Vice Principal, Islamabad Model College for Boys, Islamabad

zahidkazmihsp@gmail.com

Abstract:

This research explores postcolonial feminist discourse in the Urdu short story with special attention to the interconnected themes of gender, identity, and resistance. It challenges the common assumption that women in Urdu fiction appear only as silent sufferers of social and colonial oppression. Instead, the study argues that these narratives present women as aware and complex individuals who actively negotiate colonial histories, national ideologies and patriarchal power structures. The research highlights that women's resistance in Urdu short stories is often delicate rather than openly argumentative. Silence, symbolic gestures, control over the female body and the reshaping of personal and collective narratives emerge as meaningful forms of protest. Such strategies allow women to assert agency within restrictive social environments. Through a close and critical reading of selected Urdu short stories, the study demonstrates that female identity is not fixed or singular. Rather, it is fluid, historically rooted and shaped by class, culture, reminiscence and lived experience.

Key words: Post colonialism, Feminist Discourse, Urdu Short Story, Gender, Identity, Resistance, Women, Silence, Body Politics, Narrative

اُردو افسانے میں مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے کو اس تحقیقی و تنقیدی مضمون میں ایک ایسے فکری و سماجی تناظر میں دیکھنے کی کاوش ہے جہاں جنس، شناخت اور مزاحمت ایک دوسرے میں مدغم نظر آتی ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی تنقید اور نسوانی فکر کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے کیوں کہ دونوں ہی طاقت، نمائندگی اور خاموش کر دیے جانے والے موضوعات کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان تحریروں میں نو آبادیاتی دور کے خیالات اور قوم کے بارے میں قائم روایتی سوچ پر بات کرتی اور ان کا تنقیدی جائزہ لیتی ہے جبکہ نسوانی فکر عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، طاقت کا غلط استعمال اور روزمرہ زندگی کی مشکلات کو سامنے لاتی ہے۔ اُردو افسانہ ان دونوں فکری دھاروں کے باہمی مکالمے کے لیے موزوں ہے کیونکہ یہ جمالیاتی اظہار کے ساتھ سماجی اور سیاسی شعور کی ایک متحرک شکل ہے۔ اُردو افسانے میں عورت کو بطور صنفی وجود کے علاوہ قوم، ثقافت اور تاریخی ملاپ کی علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی حالات میں عورت کا جسم، زبان، یادداشت، قومی تشخص اور تہذیبی بقا کے استعارے بن جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُردو افسانوں میں عورت اپنی مرضی اور احساسات کا اظہار خود کرتی ہے یا پھر مردوں، قوم اور نو آبادیاتی سوچ کے اثرات کے

درمیان اپنے خیالات، احساسات اور اپنی پہچان کو سمجھنے اور ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت سے افسانوں میں عورت کی آواز مکمل خود مختاری کی بجائے ایک کشمکش کی صورت میں سامنے آتی ہے وہ کوشش تو کرتی ہے لیکن وہ اپنی بات کرتے ہوئے بھی معاشرے میں موجود طاقت اور اثر ورسوخ سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتی۔ جارج رٹزر (George Ritzer) ایک ممتاز امریکی اور سماجیات کے ماہر ہیں۔ وہ طاقت کے ڈھانچوں پر تنقیدی نقطہ نظر پیش کرتے ہیں:

> "Social Facts are the social structures and cultural norms and values that are external to, and coercive of, actors."

"معاشرتی حقائق معاشرے کی ساخت میں پائے جانے والے وہ ثقافتی، اصول و اقدار ہیں جو ان پر عمل پیرا ہونے والوں پر بیرونی طور پر زبردستی نافذ کیے جاتے ہیں۔"(۱)

معاشرتی حقائق وہ ثقافتی اصول اور اقدار ہیں جو فرد کی سوچ اور اظہار کو غیر محسوس انداز سے طے کرتے ہیں اور اُردو افسانے میں عورت اپنی بات معاشرے کے دباو اور پابندیوں کے اثر میں رہ کر بیان کرتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی ذات سے ہم کلام ہونے کے ساتھ مردانہ، قومی اور استعماری بیانیوں کے بیچ اپنی شناخت کی تلاش میں ہوتی ہے۔ بہت سے افسانوں میں عورت کا اظہار کشمکش کی صورت میں سامنے آتا ہے جہاں وہ مزاحمت تو کرتی ہے مگر وہ جس زبان میں بات کرتی ہے اور جو وہ کہتی ہے وہ معاشرے میں موجود طاقت اور اثر و رسوخ سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتا۔ اگرچہ عورت کی بات محدود ہوتی ہے لیکن اس سے معاشرے کی حقیقت اور اس کے دباو کا اندازہ ہوتا ہے جو فرد پر بیرونی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مشرقی عورت اور غیر ملکی مرد کے تعلق میں طاقت اور تاریخی معاشرتی حقائق کی عکاسی کرتا ہے۔ مرد کی دولت اور معاشرتی حیثیت اسے برتری دیتی ہے جب کہ عورت کے جذبات، وجود اور تاریخ کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یعنی عورت کی زندگی اور جسم پر مرد کا اثر اور اختیار ماضی کے حالات و روایات اور معاشرتی رسم و رواج، سوچ، اصول اور رویوں سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اسی تناظر میں نسوانی مزاحمت کی نوعیت سادہ، ذاتی تجربے تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایک سیاسی عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ روزمرہ زندگی کے چھوٹے فیصلے، خاموش انکار، جسمانی اختیار اور یادداشت کی بازیافت ایسے ذرائع ہیں جو کھل کر جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں مزاحمت کبھی واضح اور کبھی علامتی شکل میں گہری معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کا اثر عوامی سطح پر روزمرہ زندگیوں پر بھی پڑتا ہے۔ اس تحقیق کا مقصد اُردو افسانے میں مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے کی تشکیل میں جنس، شناخت اور مزاحمت ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح مربوط ہیں۔ منتخب افسانوں کے تنقیدی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی نمائندگی جامد نہیں بلکہ مختلف سماجی، طبقاتی اور تاریخی سیاق میں بدلتی رہتی ہے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ نو آبادیاتی دور کے بعد عورت کی شناخت پر استعمار کا اثر ہے یا اس کی اپنی فکری آزادی ہے۔ نسوانی جدوجہد کا منفرد پہلو یہ ہے کہ اُردو افسانہ عورت کی خاموشی کو بھی مزاحمت کی طاقت بنا دیتا ہے۔ شہزاد منظر افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جدید افسانہ آج بھی ترقی پسند افسانے کی طرح اپنے دور کا ترجمان اور عکاس ہے اور اس میں بھی سیاسی جبر، سماجی ناانصافیوں، پامال عقائد، شکستہ اقدار اور فرسودہ نظام حیات کے خلاف شدید احتجاج پایا جاتا ہے۔"(۲)

ترقی پسند افسانے کی طرح جدید افسانہ بھی اپنے عہد سے مربوط ہے کیونکہ وہ اپنے دور کے حالات، سیاسی دباؤ، سماجی ناانصافی، اقدار کی شکست و ریخت اور پرانے اور ناکام نظامِ زندگی پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے لیکن جدید افسانے کی پیش کش میں فرق ہے۔ ترقی پسند افسانہ زیادہ واضح اور براہ راست مزاحمت کرتا تھا جب کہ جدید افسانہ علامت، استعارے، خاموشی اور باطنی کیفیات کے ذریعے اسی مزاحمت کو پیش کرتا ہے اور یہ بھی اپنے زمانے کا عکاس اور ترجمان ہے۔ مابعد نو آبادیات ایک فکری نظریہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ استعمار کے بعد بھی ذہنی اور ثقافتی اثرات باقی رہتے ہیں۔ استعمار نے زمینوں پر قبضے کے ساتھ اس خطہ کے لوگوں کی زبان، علم، جنس اور شناخت کو بھی اپنی سوچ اور طریقے کے مطابق بدل دیا۔ جو اب بھی نو آبادیاتی وراثتی عمل کی باقیات ہیں اور ان اثرات کو آج بھی سماج اور ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ استعمار زدہ کی شناخت ایک ملغوبہ ہے جہاں فرد اپنے مقامی تجربے اور قومی بیانیے کے درمیان معلق رہتا ہے۔ اُردو افسانہ دیکھاتا ہے کہ کردار اپنی شناخت کو استعمار کے اثرات کے ساتھ دوبارہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی عمل مابعد نو آبادیاتی شعور کی بنیاد بنتا ہے۔ انیس ہارون صاحبہ تانیثیت کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "فیمینزم نام ہے اس احساس کا کہ معاشرے میں پدری نظام مسلط ہے اور مادی اور نظریاتی سطح پر عورت کی محنت، جنسیت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا خاندان میں اور کام کرنے کی جگہ پر غرض پورے معاشرے میں استحصال کیا جاتا ہے اور اسے کچلا جاتا ہے۔" (۳)

نسوانی تنقید کے ادبی حلقے عورت کے مسائل کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ لبرل فیمینزم (Liberal Feminism) مساوی حقوق، تعلیم اور قانونی برابری پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ نظام میں اصلاح کے ذریعے عورت کی حالت بہتر بنائی جا سکتی ہے جبکہ ریڈیکل فیمینزم (Radical Feminism) جبر کی اصل وجہ پدرشاہی نظام کو سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک عورتوں کے مسائل قوانین بنانے اور ان میں تبدیلی سے حل نہیں ہو سکتے بلکہ معاشرے کے ان بنیادی ڈھانچوں کو بھی بدلنا ضروری ہے۔ جو عورت کو مرد کے مقابلے میں کم حیثیت دیتے ہیں تاہم ترقی پذیر ممالک کی نسوانی فکر اس بات کو رد کرتی ہے کہ مغرب میں بنائے گئے یہ نظریات ایشاء، افریقہ اور دیگر معاشروں کی عورتوں کے سماجی، ثقافتی اور معاشی تجربات کو سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ادبی حلقے نسل، قوم اور استعمار کے اثرات کو صنفی جبر کے ساتھ جوڑ کر دیکھاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں ان تینوں حلقوں کے اثرات کہیں صاف اور کہیں مدہم نظر آتے ہیں مگر تیسری دنیا کی نسوانی فکر زیادہ بامعنی ہے کیونکہ یہ مقامی سماجی حقیقتوں کو مرکزیت دیتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نسوانیت نشاندہی کرتی ہے کہ عورت کا مسئلہ صنفی، تاریخی اور سیاسی ہے۔ ڈاکٹر ماجد ممتاز، ڈاکٹر طیبہ بشیر اور ڈاکٹر تہمینہ ممتاز اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "فیمینزم کے ادبی رجحان نے اُردو ادب میں خواتین کے حقوق کی جد وجہد کو نہایت اہمیت دی ہے۔ کئی ناول اور افسانے ایسے ہیں جن میں عورت کی مظلومیت کے بجائے اس کی مزاحمت، خود مختاری، اور طاقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ زاہدہ حنا، کشور ناہید، اور بانو قدسیہ کی تحریروں میں عورت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ عصر حاضر میں نسرین انجم بھٹی، نور الہدی شاہ، اور فہمیدہ ریاض کی تحریروں میں خواتین کے حقوق پر زیادہ شدت سے گفتگو کی جارہی

ہے۔ ان تحریروں میں معاشرتی رویوں کو چیلنج کیا گیا ہے اور عورت کو ایک فعال اور خود مختار انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے "(۴)

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فیمینزم نے اُردو ادب میں عورت کو کمزور کے بجائے باخبر، بااختیار اور مزاحمتی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ مختلف ادیبوں نے عورت کے حقوق، خود مختاری اور اس کی سماجی جدوجہد کو نمایاں کیا ہے۔ گایتری چکرورتی سپیواک مابعد نو آبادیاتی تنقید اور نسوانی نظریے کی ایک اہم دانشور ہیں جن کا تعلق بھارت سے ہے۔ ان کی علمی شناخت زیادہ تر مغربی جامعات میں تدریس اور تحقیق کے باعث قائم ہوئی۔ ان کی نمایاں تحریر "Can the SubalternSpeak?" جدید تنقیدی مباحث میں ایک بنیادی متن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں سپیواک اس نکتے کی وضاحت کرتی ہیں کہ طاقت، علم اور نمائندگی کا غالب نظام اکثر حاشیے پر موجود طبقوں کی حقیقی آواز کو سامنے آنے نہیں دیتا۔ ان کے مطابق جب "سب آلٹرن" کی بات کی جاتی ہے تو طاقتور طبقے اپنے الفاظ اور اپنے نقطہ نظر سے بات کرتے ہیں. جس سے اصل حقیقت چھپ جاتی ہے۔ "سب الٹرن" کی اصطلاح حاشیے پر موجود نچلے طبقے کی عورت، مزدور اور کمزور طبقات مراد ہیں۔ سپیواک نظریہ علم اور اقتدار کے باہمی تعلق کو بیان کرتی ہیں اور ہمیں ان کی نمائندگی کے دعووں پر محتاط نظر ڈالنے کی دعوت دیتی ہیں۔ گایتری اسپیواک کا تصور "خاموش عورت" اس بات کا اشارہ ہے کہ نو آبادیاتی اور قومی بیانیوں میں عورتیں بولنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود انہیں سنا نہیں جاتا اور انہیں نمائندگی کا اختیار بھی نہیں ہے۔ اس طرح حاشیہ پر موجود چھوٹے طبقات کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "The small peasant proprietors cannot represent themselves; they must be represented. Their representative must appear simultaneously as their master, as an authority over them, as unrestricted governmental power that protects them from the other classes and sends them rain and sunshine from above" .
>
> "چھوٹے کسان مالکان خود اپنی نمائندگی کرنے کے قابل نہیں ہوتے اس لیے ان کی نمائندگی کوئی دوسرا کرتا ہے۔ ان کا نمائندہ بیک وقت ان کا حاکم بھی بن کر سامنے آتا ہے ان پر اختیار رکھنے والی اتھارٹی بھی اور ایسی مطلق سرکاری طاقت بھی جو انہیں دوسری طبقات سے تحفظ فراہم کرتی ہے اور گویا اوپر سے ان کے لیے بارش اور دھوپ کا انتظام کرتی ہے۔"(۵)

نچلے اور کمزور طبقات خود اپنی آواز بننے کے قابل نہیں سمجھے جاتے اس لیے طاقتور طبقہ ان کی نمائندگی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ یہ نمائندگی دراصل اقتدار کی ایک شکل ہوتی ہے جہاں نمائندہ محافظ کے بجائے حاکم بن جاتا ہے۔ سپیواک کے مطابق اس عمل میں "سب الٹرن" خصوصاً عورت کی آواز دب جاتی ہے اور اس کے تجربات طاقتور طبقے کی زبان اور فہم میں ڈھل کر مسخ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے عورت بولنے کی صلاحیت کے باوجود "خاموش" کر دی جاتی ہے اور اس سے اپنی نمائندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ چندرا تلاپادے موہنتی (Chandra Talpade Mohanty) ایک معروف مابعد نو آبادیاتی نسوانی مفکرہ ہیں جنہوں نے مغربی نسوانیت پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے بتایا کہ مغربی نظریات میں غیر مغربی عورت کو اکثر ایک مظلوم اور بے اختیار پیش کیا جاتا ہے جس سے اس

کے حقیقی اور متنوع تجربات سامنے نہیں آپاتے۔ موہنتی کے نزدیک عورت کی شناخت کو اس کے سماجی، تاریخی اور ثقافتی پس منظر کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کی کتاب "Under Western Eyes: Feminist Scholarship and Colonial Discourses" جو بعد میں ان کی اس کتاب "Feminism Without Borders: Decolonizing Theory, Practicing Solidarity" میں شامل ہوئی۔ وہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ نسوانیت کو مقامی حالات اور عورت کی عملی جدوجہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیے تاکہ عورت کو ایک باشعور اور فعال کردار کے طور پر تسلیم کیا جا سکے۔ غیر مغربی عورت کو مظلوم اور بے اختیار دیکھایا جاتا ہے جس سے اس کی تخلیقی صلاحیتں چھپ جاتی ہیں۔ اُردو افسانہ ان دونوں نظریات کو عملی طور پر پرکھنے اور سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے جہاں عورت کبھی خاموشی اور کبھی مسلط شدہ شناختوں کو رد کر کے مزاحمت اور اپنی ذات کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ چندرا موہنتی لکھتی ہیں:

> "This average Third World woman leads an essentially truncated life based on her feminine gen- der (read: sexually constrained) and her being ''Third World'' (read: igno- rant, poor, uneducated, tradition-bound, domestic, family-oriented, victim-ized, etc.). This, I suggest, is in contrast to the (implicit) self-representation of Western women as educated, as modern, as having control over their own bodies and sexualities and the freedom to make their own decisions."

"یہ اوسط درجے کی تیسری دنیا کی عورت اپنی نسوانی شناخت کی بنیاد پر ایک محدود اور کٹے ہوئے وجود کی زندگی گزارتی دکھائی جاتی ہے (یعنی جنسی طور پر مقید) اور محض اس لیے کہ وہ "تیسری دنیا" سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے جاہل، غریب، غیر تعلیم یافتہ، روایت کی اسیر، گھریلو، خاندان مرکز اور مظلوم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ میں یہ تجویز کرتی ہوں کہ یہ مغربی عورتوں کے ضمنی یا پوشیدہ خود نمائی کے برعکس ہے جو تعلیم یافتہ، جدید، اپنے جسم اور جنسی خواہشات پر قابو رکھنے والی اور اپنے فیصلے خود کرنے کی آزادی رکھنے والی کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔"(۶)

مغربی نسوانی فکر اکثر ترقی پذیر ممالک کی عورت کو ایک ہی طرح کی مظلوم اور بے اختیار ہستی سمجھتی ہے۔ اس سوچ میں عورت کی زندگی، حالات، جدوجہد اور اس کے مختلف تجربات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس سے ایک غیر حقیقی اور یک رخی تصویر سامنے آتی ہے۔ تیسری دنیا کی نسوانی فکر عورتوں کی یکجہتی کا تصور لئے ہوئے ہے مگر اندیشہ ہے کہ اس میں مختلف ثقافتوں، زبانوں اور مخصوص سماجی حالات میں جینے والی عورتوں کے فرق کو نظر انداز کر کے سب کو ایک جیسا سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ استعماری سوچ کا فروغ ہے جو مشکل حقیقتوں کو آسان حصوں میں تقسیم کرتی ہے لیکن اُردو افسانہ بتاتا ہے کہ عورت کی شخصیت متنوع اور متحرک ہے کیونکہ یہ نظریہ عورت کو علامت کی بجائے حقیقی اور سماجی شخصیت کے طور پر سمجھتا ہے اس لئے یہ مطالعہ نظریے اور متن کے درمیان ایک ایسا مکالمہ ہے جو تفہیم کو ترجیح دیتا ہے۔

اُردو افسانہ اپنے فکری موضوعات، انداز بیاں، نظریات اور فنی طریقہ کار یعنی زبان، کردار نگاری اور اسلوب کے اعتبار سے براہ راست نو آبادیاتی حالات سے متاثر ہوا۔ برطانوی اقتدار نے برصغیر کے سماجی ڈھانچے، معاشی رشتوں اور ثقافتی اقدار کو اس طرح بدلا کہ ادب تخلیقی اظہار کی بجائے ردِ عمل کی صورت اختیار کر گیا۔ جس سے اُردو افسانہ ایک ایسی صنف کے طور پر ابھرا جس نے بدلتے ہوئے سماج کو بیان کیا اور اس کا تجزیہ بھی کیا۔ نو آبادیاتی سماج میں پیدا ہونے والی غیر مساوی، اجنبیت اور شناخت کے بحران نے افسانے میں سنجیدہ اور معنی خیز خیالات شامل کئے جن میں آزادی، اپنی شناخت، خودداری کا شعور، مقامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کی فکر، سماجی ناانصافی اور جبر کے خلاف مزاحمت جیسے موضوعات نمایاں ہوئے جن کے بغیر مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے کو سمجھنا ممکن نہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اُردو افسانے کو ایک منظم اور مضبوط انداز میں آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا جس نے ادب کو معاشرے کے مسائل اور ذمہ داریوں سے وابستہ کر دیا اور نو آبادیاتی جبر، معاشی استحصال اور طبقاتی ناانصافی کو مرکزی نکتہ قرار دیا۔ اس طرح افسانہ ایک فرد کے ذاتی دکھ اور تکلیف کو پورے معاشرے کے مشترکہ دکھ کے طور پر سمجھا جانے لگا اور اس نے سماج کی مکمل تصویر دیکھائی۔ اس لئے نو آبادیاتی سماج کے اثرات افسانوں میں پس منظر کی بجائے ایک فعال قوت کے طور پر موجود ہیں۔ جو کردار کی زندگی اور کہانی کو بنتے ہیں۔ اسی عمل میں عورت کا کردار چادر اور چار دیواری تک محدود نہیں رہتا بلکہ نو آبادیاتی دور کی حقیقتوں کی طرف بالواسطہ اشارہ بن جاتا ہے۔ اُردو افسانے کے ابتدائی دور میں عورت کو زیادہ تر مظلوم دیکھایا جاتا تھا جسے وہ سماجی جبر اور معاشی بے بسی کا شکار ہو۔ یہ تصویر عورت کو متاثرہ اور کمزور وجود کے طور پر پیش کرتی ہے۔ دوسری طرف عورت کو اخلاقی علامت میں ڈھالا گیا۔ جہاں اس کی عصمت، قربانی اور خاموشی کو قوم کی عزت، وقار کو تہذیبی بقا سے جوڑ دیا گیا۔ یہ انداز عورت کو اہم دیکھاتا ہے لیکن اس کی اپنی شخصیت ،شناخت کو اجتماعی مفاد کی خاطر محدود کر دیتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نسوانی تنقید اس بیانیے کو آشکارہ کرتی ہے۔ موہت نمار یہ لکھتی ہیں:

> "The Quilt, also known as the "Lihaaf" serves as a symbolic representation that conveys a range of messages. The quilt serves as a representation of a Pandora's Box, which, upon its revelation, inflicts profound emotional wounds upon the narrator".
>
> "افسانہ لحاف (The Quilt) ایک علامتی پیکر کے طور پر سامنے آتا ہے جو اپنے اندر متعدد معنوی جہتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لحاف دراصل ایک پنڈورا بکس کی مانند ہے جو کھلتے ہی راوی کے باطن پر گہرے نفسیاتی اور جذباتی زخم ثبت کر دیتا ہے۔"(۷)

اُردو افسانہ ایک سماجی دستاویز کے طور پر طبقاتی تقسیم، صنفی امتیاز اور اقتدار کے رشتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ معاشرے میں موجود مختلف طبقات اور برادریاں ان کی حیثیت دولت یا معاشی حالات سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس میں جنس بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب طبقاتی فرق اور صنفی فرق ایک ساتھ کام کرتے ہیں تو عورتوں یا کمزور طبقات کو امتیاز، محرومی اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس سے جبر کی نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں یعنی ایسے حالات میں کسی فرد کو اس کی جنس، طبقے یا سماجی حیثیت کی وجہ سے کم مواقع، کم آزادی یا غیر مساوی سلوک برداشت کرنا پڑتا ہے اس لئے عورت کا تجربہ مرد کے تجربے سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ کئی طاقتیں اس پر اثر ڈالتی ہیں۔ افسانہ طاقت کے اثرات کو کرداروں کے رویے اور تعلقات سے دیکھاتا ہے۔ اس طرح اُردو افسانہ کہانی نہیں رہتا بلکہ

ایک ایسا متن بن جاتا ہے جو نو آبادیاتی اور پدر شاہی نظام کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے کے لیے مضبوط فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی تناظر میں جنس (Gender) صرف جسمانی فرق نہیں بلکہ معاشرتی اور سیاسی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے استعمار کا استعمار زدہ پر اختیار قائم رہتا ہے۔ اُردو افسانہ عورت کے جسم کو ایک خاص صورتحال میں پیش کرتا ہے جو نو آبادیاتی نظام، مقامی اخلاقیات اور سماجی اصولوں سے ٹکراتے ہیں وہاں عورت کا جسم ذاتی نہیں رہتا یعنی عورت کا جسم اپنی مرضی یا اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ سماج، قوانین یا با اثر افراد اس کے فیصلے کرتے ہیں یعنی وہ جو کچھ پہنتی ہے یا کرتی ہے اس کا فیصلہ وہ خود نہیں کر سکتی بلکہ لوگ یا سماج اس پر اثر انداز ہوتا ہے اس عمل سے جسم پر طاقت اور اختیار قائم رکھنے کا نظام وجود میں آتا ہے۔ افسانہ روزمرہ زندگی کی تفصیلات کا اظہار ہے کہ جہاں کے لوگوں کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کام اور رویے بھی معاشرے میں موجود طاقت اور اختیار کے بڑے نظاموں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> "آج کے اُردو افسانے نے لمحہ بہ لمحہ بدلتی زندگی کے ہر روپ بہروپ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور کچھ اس طرح جذب کر لیا ہے جیسے مشینی زندگی کا لایا ہوا تہذیبی انقلاب اسی کے فروغ کے لیے رونما ہوا ہے۔"(۸)

نو آبادیاتی نظام میں عورت کو اخلاقیات کے نام پر قابو کرنے کی کوشش کی گئی جس میں مقامی روایات اور استعماری قوانین دونوں شامل تھے۔ عورت کے لباس، نقل و حرکت اور رویّوں پر سماجی نگرانی جو ایک بڑے سیاسی منصوبے کا حصہ تھی جس کا مقصد سماج کو قابل گرفت بنانا تھا۔ اُردو افسانے میں یہ نگرانی خاندان، محلے یا رسم و رواج کی صورت میں سامنے آتی ہے لیکن اس کے پیچھے اقتدار کا سیاسی منصوبہ ہے جو استعمار نے قائم کیا۔ جس سے عورت کا جسم ایک ایسی علامت بن گیا جسے اخلاقیات کا نام دے کر طاقت اور اختیار کے نظام کو مضبوط اور قائم رکھا گیا۔ اُردو افسانے میں جنسی تشدد ایک ذاتی المیہ نہیں بلکہ یہ تقسیمِ ہند کے تناظر میں تاریخی ناسور کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ تقسیم کے دوران عورت کا جسم دشمنی، انتقام اور قومی غیرت کا میدان بنا رہا اور یہ تشدد استعماری دور کے اثرات کا نتیجہ تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔ افسانوں میں عورت کی خاموشی کمزوری نہیں بلکہ اس صدمے کی علامت ہے جسے زبان کے ذریعے بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ وہ خاموشی ہے جسے سماج سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات یہ تشدد جسمانی ہونے کے ساتھ ساتھ رویوں، لفظوں اور سوچ سے ہوتا ہے۔ بادشاہ منیر بخاری عورت کو جنس کے تناظر میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "عورت کو بحیثیت انسان شاید اُردو ادب کے ادیب نے دیکھا ہی نہیں۔ جہاں بھی اُردو ادب میں عورت نظر آئی وہ کسی اور حیثیت سے ملے گی۔ کہیں وہ محبوبہ کی صورت میں کہیں بیوی، کہیں طوائف کہیں ساس کہیں بہو غرض معاشرتی زندگی میں عورت کو بحیثیت شے کے پیش کرنے کا رجحان ہی رہا ہے۔"(۹)

بخاری صاحب لکھتے ہیں کہ اُردو ادب میں عورت کو خود ایک مکمل انسان کے طور پر نہیں دیکھا گیا۔ ادیبوں نے عورت کو زیادہ تر کسی مخصوص کردار یا معاشرتی حیثیت میں پیش کیا ہے جیسے محبوبہ، بیوی، طوائف، ساس یا بہو وغیرہ یعنی عورت کو اپنی شخصیت اور حقوق کے ساتھ نہیں بلکہ صرف مردوں کے تعلقات اور معاشرتی کردار کے تناظر میں دکھایا گیا۔ اس طرح ادب میں عورت کو ایک "جنس" یا چیز کے طور پر پیش کرنے کا رجحان رہا ہے۔ اُردو افسانہ نسوانی جسم کو دکھی اور کمزور نہیں دیکھاتا بلکہ مزاحمت، طاقت اور

انکار کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ نسوانی جسم سے عورت کا جسمانی وجود نہیں بلکہ اس سے مراد اس کی پوری شخصیت ہے۔ جس میں اس کی شناخت، عزت، خواہشات اور معاشرے میں اس کی عزت و مقام شامل ہیں۔ عورت کا خاموش انکار ان توقعات کو رد کرنا ہے جو سماج عورت پر مسلط کرتا ہے۔ اس طرح افسانوں میں عورت کے رویے اقتدار کے خلاف علامتی مزاحمت بن جاتے ہیں۔ عورت ہمیشہ کھل کر مخالفت نہیں کرتی بلکہ وہ علامتوں کے ذریعے اظہار کرتی ہے جیسے اس کا انکار کرنا، سوال اٹھانا، خاموشی اختیار کرنا، اپنی مرضی سے فیصلہ کرنا یا معاشرتی پابندیوں کو قبول نہ کرنا مزاحمتی علامتیں ہیں۔ مثلاً اگر عورت کسی ایسے فیصلے کو ماننے سے انکار کرے جو اس پر زبردستی مسلط کیا جارہا ہو تو اس کا یہ انکار مردانہ اختیار اور طاقت کے خلاف احتجاج سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا سوال کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ طاقت کے اصولوں کو بغیر سوچے سمجھے قبول نہیں کرتی۔ عورت کے یہ چھوٹے چھوٹے رویے اقتدار کو چیلنج کرنے اور اپنی آزادی کا اظہار کرنے کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس طرح اُردو افسانے میں نسوانی جسم ایک ایسا مقام بن جاتا ہے جہاں جبر، آزادی اور خاموشی ایک ساتھ مل کر نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی اُردو افسانے میں شناخت ایک ایسا عمل ہے جو کوئی مقررہ چیز نہیں بلکہ انسان کی سوچ، تجربات اور حالات کے ساتھ مسلسل بنتی اور بدلتی رہتی ہے۔ وقت کے ساتھ انسان نئے تجربات حاصل کرتا ہے۔ وہ مختلف لوگوں اور ثقافتوں سے تعلق پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی اپنی سمجھ بھی بدلتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شناخت بھی نئی شکل اختیار کرتی رہتی ہے اور عورت اس کا مرکز ہے۔ قوم، مذہب اور طبقہ عورت کی شناخت بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن بعض اوقات یہی چیزیں اس کی آزادی پر پابندیاں بھی عائد کرتی ہیں۔ اُردو افسانوں میں عورت کو کبھی ماضی کی روایات میں جکڑا اور کبھی سماجی دباؤ کے بوجھ تلے دکھایا جاتا ہے۔ عورت کبھی ان رکاوٹوں سے نکل کر اپنی نئی شناخت بنانے کی کوششیں کرتی نظر آتی ہے۔ ایسے حالات میں عورت تابع نہیں رہتی بلکہ اپنے اندر سوچنے اور سوال کرنے کی ہمت بھی پیدا کر لیتی ہے۔ اُردو افسانے میں قومی بیانیہ عورت کو ماں یا وطن کی صورت میں پیش کرتا ہے جہاں اس کی ذات تقدس اور قربانی سے وابستہ ہوتی ہے۔ ماں کی علامت قوم کی پرورش اور بقا کی نمائندہ ہے جبکہ عورت کا جسم وطن کے تصور سے جڑ کر مقدس بن جاتا ہے۔ ایثار و قربانی کی یہ علامت اسے اہم مقام تو دیتی ہے لیکن اس کی اپنی خواہشات اور رائے محدود کر دیتی ہے۔ افسانے میں کچھ کردار اس علامتی مقام کو مان لیتے ہیں جبکہ کچھ کردار معاشرے کی طرف سے مسلط کردہ پابندیوں اور توقعات کو کھل کر رد کرنے کی بجائے خاموشی اور اپنے فیصلوں، رویّوں کے ذریعے مسترد کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلے کرتے ہیں اور رائج رسم و رواج کی مخالفت کرتے ہیں اور دوسروں کی بنائی ہوئی شناخت قبول کرنے کی بجائے اپنی خواہشات، تجربات اور سوچ کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ اپنی الگ اور خود مختار پہچان بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے مابعد نو آبادیاتی تناظر میں عورت کی شناخت یکساں نہیں رہتی کیونکہ مذہب اور طبقہ عورت کی زندگی اور سوچ کو بدلتے ہیں۔

مسلم عورت تاریخ، روایت اور مذہبی شناخت کے ساتھ جڑی نظر آتی ہے جبکہ ہندو عورت کے کردار میں رسم و رواج اور سماجی توقعات کا دباؤ نمایاں ہوتا ہے۔ دلت نسوانی فکر اور حاشیائی عورت کا تجربہ ان دونوں سے مختلف اور زیادہ مشکل ہے کیونکہ وہ صنفی جبر کے ساتھ ساتھ طبقاتی اور سماجی امتیازی سلوک کا سامنا کرتی ہے۔ اُردو افسانہ عورت کے مختلف تجربات دیکھا کر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ عورت کا تجربہ ایک جیسا نہیں ہوتا اور نسوانی وجود کئی پہلو رکھتا ہے۔ اُردو افسانے میں داخلی خود کلامی عورت کے اندرونی خیالات، احساسات اور ذہنی کیفیت کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے افسانہ نگار عورت کے دل میں چھپے خوف، خواہشات،

الجھنوں اور پریشانیوں کو سامنے لاتا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ عورت معاشرتی پابندیوں، رشتوں، صنفی امتیاز اور اپنی شناخت کے بارے میں اندر ہی اندر کیا سوچتی اور محسوس کرتی ہے۔ اس طرح داخلی خود کلامی کے ذریعے عورت کی زندگی کے مسائل، ذہنی کشمکش اور اندرونی دکھ کو زیادہ وسعت سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور قاری اس کی حقیقی کیفیت سے بہتر طور پر واقف ہو جاتا ہے۔ یہی خود کلامی وہ لمحہ دیکھاتی ہے جب عورت دوسروں کی پہچان سے دور ہو کر اپنی ذات اور فیصلوں پر سوچتی اور سمجھتی ہے۔ وجودی بحران اسی ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ ہے جو قومی، مذہبی اور سماجی بیانیے اس پر مسلط کرتے ہیں۔ افسانہ اس مشکل وقت کو کمزوری نہیں بننے دیتا بلکہ عورت کو نئی پہچان بنانے کا موقع دیتا ہے۔ جہاں عورت اپنی یادداشت، تجربے اور احساس کو بنیاد بنا کر خود کو نئے سرے سے معنی دیتی ہے۔ اس طرح داخلی خود کلامی مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے میں مزاحمت کی ایک لطیف شکل ہے۔ موہت نماریہ اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

> "A significant focus of Chughtai's short stories pertains to the challenges encountered by women. Chughtai was captivated by the plight of oppressed women who valiantly fought for their rights. In the majority of her short works, she attributes the unequal treatment of women to societal factors."
>
> " عصمت چغتائی کے افسانوں کا ایک نمایاں اور مرکزی موضوع عورتوں کو درپیش مسائل اور جدوجہد ہے۔ وہ مظلوم عورتوں کی حالتِ زار سے گہرا لگاؤ رکھتی تھیں، خصوصاً ان عورتوں سے جو سماجی جبر کے باوجود اپنے حقوق کے لیے ڈٹ کر کھڑی ہوتی ہیں۔ ان کی بیشتر افسانوی تخلیقات میں عورت کے ساتھ ہونے والے غیر مساوی سلوک کی ذمہ داری فرد کے بجائے سماجی ڈھانچے اور معاشرتی رویّوں پر عائد کی گئی ہے۔"(۱۰)

عصمت چغتائی کے افسانوں میں عورت کے مسائل کو سماجی جبر کا نتیجہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور یہی زاویہ داخلی خود کلامی کے تصور سے جڑ جاتا ہے۔ اُردو افسانے میں عورت جب اپنے باطن سے گفتگو کرتی ہے تو وہ سماج کی مسلط کردہ شناخت کے بغیر اپنے وجود پر غور کرتی ہے۔ یہ خود کلامی اس وجودی بحران کو نمایاں کرتی ہے جو قومی، مذہبی اور سماجی بیانیوں کی وجہ سے جنم لیتا ہے لیکن افسانہ اسے شکست نہیں بننے دیتا۔ اس عمل سے عورت اپنے ماضی کے تجربات اور یادوں کو مجتمع کر کے اپنی شناخت کو نئے معنی دیتی ہے۔ یہ ذہنی کیفیت نہیں بلکہ مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے میں خاموش مزاحمت ہے۔

مابعد نو آبادیاتی اُردو افسانے میں مزاحمت کی کوئی ایک شکل نہیں ہوتی بلکہ کبھی یہ براہِ راست ٹکراؤ کی صورت میں سامنے آتی ہے اور کبھی غیر محسوس انداز میں معلوم ہوتی ہے اور نسوانی بیانیہ مختلف صورتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ عورت ہمیشہ معاشرے کے موجودہ نظام کو مکمل طور پر چھوڑ کر یا اس سے باہر نکل کر مزاحمت نہیں کرتی بلکہ وہ اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنے فیصلوں، رویوں اور خاموش مزاحمت کے ذریعے اس کی پابندیوں کو کمزور کرتی ہے۔ مثلاً وہ اپنے لیے فیصلہ خود کرتی ہے۔ وہ مسلط کردہ کردار کو پوری طرح قبول نہیں کرتی۔ وہ اپنی رائے ظاہر کرتی ہے اور روایتی اصولوں پر عمل کرنے سے انکار کرتی ہے جو اسے محدود کرتے ہیں۔ وہ ظاہری طور پر اسی سماجی نظام کا حصہ رہتے ہوئے اس کے بنائے ہوئے اصولوں کو اندر سے کمزور کرتی اور اپنی شناخت کے لیے جگہ بناتی ہے۔ اس طرح مزاحمت ردعمل نہیں رہتی بلکہ سوچ سمجھ کر اپنایا گیا مستقل طریقہ بن جاتی ہے۔ اُردو افسانے میں "خاموش مزاحمت"

نسوانی کرداروں کی ایک حکمت عملی ہے کیونکہ روزمرہ زندگی میں خاموشی، انکار یا متوقع ردعمل سے گریز کرنا مستحکم اقتداری ڈھانچے کو کمزور کرنا ہے۔ خاموش انکار کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ علامتی رویے جیسے خاموشی، نظر کا پھیر لینا یا معمول سے مختلف انتخاب یہ اس بات کا اظہار ہے کہ عورت انکاری ہے۔ افسانہ ان رویوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ خاموشی اطاعت کی بجائے سوچا سمجھا سیاسی عمل بن جاتی ہے۔ بیانیاتی مزاحمت میں عورت اپنی کہانی خود سنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا مقصد صرف الفاظ استعمال کرنا نہیں بلکہ وہ ان روایتی سوچوں، تصورات اور نظریات کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو صدیوں سے مرد اور نو آبادیاتی طاقتیں قائم کرتے آئے ہیں۔ اُردو افسانے میں جب عورت اپنی یادداشت، جسم اور تجربے کو اپنی زبان میں بیان کرتی ہے تو وہ پہلے سے قائم سوچ اور نظریے کو بدل کر اپنی بات اور اپنا موقف سامنے لاتی ہے۔ جس سے کہانی میں اہمیت اور توجہ کا مرکز بدل جاتا ہے اور وہ کردار جو پہلے حاشیے پر تھے بیانیے کے محرک بن جاتے ہیں۔ اس طرح مزاحمت کہانی کے اندر سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ نسوانی آواز کی سب سے مضبوط صورت تحریری خود مختاری ہے جہاں عورت اپنی زندگی کے فیصلوں میں خود مختار ہوتی ہے۔ خود نوشت بیانیہ عورت کو کہانی کے موضوع کی بجائے مصنفہ بننے کا موقع دیتا ہے جس سے اس کا توازن بدلتا ہے۔ کچھ افسانے عورت کی کہانی کو شکست پر ختم نہیں کرتے بلکہ اسے آزاد مستقبل کی امید دیکھاتے ہیں۔ اُردو افسانہ یہ بات ماننے سے انکاری ہے کہ مزاحمت صرف اونچی آواز میں ہی ہوتی ہے۔ اگر خاموشی سوچ سمجھ کر اختیار کی جائے تو وہ بھی ایک سیاسی عمل بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ طاقت کے نظام کو جواب نہیں دیتی جو وہ چاہتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نسوانی سوچ بتاتی ہے کہ مزاحمت کی اہمیت شور میں نہیں بلکہ اس کے اثر اور معنی میں ہوتی ہے۔ بعض اوقات کچھ نہ کہنا ہی مزاحمت کا سب سے طاقتور طریقہ ہوتا ہے۔

اُردو افسانہ مختلف ادوار، اسالیب اور نظریاتی زاویوں سے مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیے کو واضح کرتا ہے۔ ان میں جنس، شناخت اور مزاحمت کے سوالات کسی ایک رخ سے نہیں بلکہ متعدد سطحوں پر ابھرتے ہیں جس سے اُردو افسانے کی فکری وسعت اور تنوع سامنے آتا ہے۔ عصمت چغتائی کا افسانہ "لحاف" اُردو ادب میں نسوانی جسم اور خواہش کو کھل کر بیان کرتا ہے اور وہ اس سماجی سوچ کا مقابلہ کرتا ہے جو عورت کی خواہشات کو ماننے سے انکار کرتی ہیں۔ "لحاف" میں جسم حیاتیاتی وجود کی بجائے ایک ایسا متن بن جاتا ہے جس پر خواہش، تنہائی اور جبر کے نشانات ثبت ہیں۔ عصمت کی مزاحمت علامت اور اشارے سے ظاہر ہوتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خاموش بیانیہ بھی طاقتور سیاسی معنی رکھتا ہے۔ اس طرح یہ افسانہ نسوانی جسم کو شرم سے نکال کر سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "مگر بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انہیں کل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے اور وہ بے چاری دبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگی۔ نہ جانے ان کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھی یا وہاں سے جب وہ ایک نواب بیگم بن کر آئیں اور چھپر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا۔ ان کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے اور بیگم جان دیوان خانے کے درزوں میں سے ان لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔" (۱۱)

عصمت چغتائی یہ بتاتی ہیں کہ بیگم جان کی تکلیف ذاتی نہیں ہے یہ سماج کی پیدا کردہ ہے۔ شادی کے بعد نواب صاحب کی بے توجہی اور تنہائی نے بیگم جان کی زندگی کو کھوکھلا کر دیا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگا یا سکتا ہے کہ مرد کو آزادی حاصل ہے مگر عورت کو خاموشی اور صبر سکھایا جاتا ہے۔ اس طرح عصمت چغتائی واضح کرتی ہیں کہ عورت کی شناخت اور اس کے دکھ کو اس کے سماجی اور ثقافتی حالات سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ غیر مغربی عورت ایک مظلوم کردار نہیں بلکہ ایک گہرے اور پیچیدہ تجربے کی حامل ہستی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی مشہور کتاب "پت جھڑ کی آواز" جو خواتین کی تحریروں اور افسانوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس میں مختلف سماجی اور ثقافتی موضوعات کے ساتھ انسانی تجربات کو بھی دکھایا ہے۔ کئی کہانیاں خاص طور پر عورتوں کی پہچان اور معاشرتی کردار کے گرد گھومتی ہیں۔ اس مجموعے میں عورتوں کے جذبات، یادیں اور سماجی مقام کو مربوط انداز سے بیان کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار اپنے اندرونی درد اور تجربات کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔ یہ افسانے مابعد نو آبادیاتی نسوانی فکر، جنس، شناخت اور مزاحمت کے نظریے کے تحت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں عورت کی شناخت ایک تاریخی تسلسل ہے کیونکہ ان کے ہاں نسوانی وجود ذاتی تجربے تک محدود نہیں بلکہ تہذیبی اور تاریخی شعور کا حامل ہے۔ نو آبادیاتی دور اور اس کے بعد کے حالات عورت کی یادداشت اور خود کو محسوس کرنے کے طریقے پر اثر ڈالتے ہیں۔ جسے قرۃ العین حیدر نہایت نفاست سے بیانیے کا حصہ بناتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں مزاحمت تاریخ کو نئے زاویے سے سمجھنے کی کوشش ہے۔ اس طرح عورت ایک ایسی بااختیار اور فعال شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے جو خود فیصلے کرتی ہے اور اپنے عمل کے ذریعے اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ جو ماضی کے تجربات اور موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی شناخت کو ایک نئے انداز میں تشکیل دیتی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اپنے ایک مضمون "قرۃ العین حیدر کا فن" جو "قومی زبان" میں جنوری ۱۹۹۰ء کو شائع ہوا لکھتے ہیں:

> "کہ تہذیب جب تاریخ کے جبر کا شکار ہوتی ہے اور تاریخی تبدیلیاں اسے کسی نئی تہذیب سے ٹکرانے پر مجبور کرتی ہیں تو نئے تہذیبی افق نمودار ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک تاریخ ایک زمانی جبر کا نام ہے۔ انقلاب آتے ہیں لیکن وقت کے دریا کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" (۱۲)

جب تہذیب تاریخی دباؤ اور تبدیلیوں کا سامنا کرتی ہے تو وہ خود کو نئی تہذیبوں کے ساتھ ٹکرا کر نئے طریقے، خیالات اور سوچ کے نئے راستے سامنے لاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک تاریخ ایک مسلسل اور مضبوط طاقت ہے جو لوگوں اور معاشروں کی سوچ، آزادی اور کام کرنے کے طریقوں پر پابندیاں لگاتی ہے۔ انقلاب یا تبدیلیاں تو آتی ہیں لیکن وقت کے گذرنے اور حالات کے مسلسل بدلنے پر ان کا اثر کم ہوتا ہے۔

واجدہ تبسم کے افسانے جنس اور سماجی منافقت کے تلخ تضاد کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ظاہری طور پر سماج اخلاقیات کا دعویدار ہے مگر اندر سے خواہش، جبر اور دوہرے شعور کا شکار ہے جہاں عورت کا جسم خواہش کا مرکز اور سماجی ریاکاری کا آئینہ ہے۔ واجدہ تبسم جنس کے موضوع کو سنسنی کی بجائے اس کا سماجی نقاب اتارتی ہیں۔ ان کی تحریریں یہ بتاتی ہیں کہ اخلاقیات کو ہمیشہ پاکیزگی، معصومیت یا اعلیٰ اقدار کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ بعض اوقات جو چیزیں معاشرے میں اخلاق کے نام پر پیش کی جاتی ہیں۔ وہ عورت کے معاملے میں طاقت، جبر اور کنٹرول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لئے واجدہ تبسم اخلاقیات کے رائج تصورات کو رد کرتی ہیں۔ وہ دکھاتی ہیں کہ اخلاقی ضابطے کس طرح عورت کے جسم، خواہش اور آواز کو دبانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا نسوانی بیانیہ

صرف عورت کی مظلومیت بیان نہیں کرتا بلکہ سماجی، مذہبی اور ثقافتی اخلاقیات کی منافقت کو بھی بے نقاب کرتا ہے جو بظاہر پاکیزگی کے نام پر عورت کی آزادی کو محدود کرتے ہیں۔ یہ بیانیہ اخلاقیات کے جامد تصور کو توڑ کر قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اصل اخلاق کیا ہے اور کس کے مفاد میں اس کی تشکیل کی گئی۔ واجدہ تبسم کے افسانے عورت کی جنسیت، سماجی رویوں اور مردانہ دوہرے معیار پر بے باک روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں "ذرا ہور اوپر"، "اترن"، "کوئلہ بھئی نہ راکھ"، "دھنک کے رنگ نہیں" اور "لڑکی بازار" شامل ہیں جو عورت کی خواہشات، جذبات اور سماجی پابندیوں کو بیان کرتے ہیں۔ دیگر کہانیاں جیسے "سستا گوشت"، "جھوٹن"، "ناگن" اور "سمندر عورت" بھی اسی موضوع کو مختلف زاویوں سے سامنے لاتی ہیں۔ خواتین کا کردار اُردو ادب میں نسوانی جسم اور سماجی منافقت کو سمجھنے کے لئے بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ وہ "کوئلہ بھئی نہ راکھ" میں لکھتی ہیں:

> "میں اس اصول کی قائل ہوں کہ محبت ایسا جذبہ ہے جو زبردستی کسی سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ جب تمہیں نے مجھے کر دیا تو میں تمہارے سامنے اس گھر میں رہ کر کیا کہ لیتی؟ میں تو بہر حال ایک بوجھ تھی، جو کسی نہ کسی سر پر لادیا جاتا۔ میں نے ہاں، نہ کچھ بھی نہ کہا بس اپنا سر جھکایا۔ اب میں سر اٹھا کر جی بھی کیسے سکتی تھی؟
> لیکن یہ کیا دکھ ہے آفتاب! جو جی سے جاتا ہی نہیں، میں کہانیاں پڑھتی تھی جن میں ہمیشہ دو محبت کرنے والوں کے بیچ زمانہ سماج یا کوئی رقیب آڑے آجاتا تھا۔
> محبت اس لئے سدا مثلث ست تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ لیکن میرے نصیب میں یہ کیسا غم لکھا تھا کہ نہ کوئی سماج میرے لیے دیوار بنا، نہ زمانہ نے اڑچن ڈالی، نہ کوئی رقیب ہی پیدا ہوا۔ تمہیں میرے سب کچھ تھے اور تمہیں نے مجھے بھری بہار میں لوٹ لیا۔ تمہیں نے سہاگ کی بندیا میرے ماتھے پر سجائی اور تمہیں نے مٹادی۔ جیون مرن کا سارا کھیل تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچا۔" (۱۳)

یہ عورت کے دکھ اور محبت کی تکلیف کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے باوجود ایک رشتے میں بندھی ہے جو اس کے لیے بوجھ ہے۔ کہانی میں مسئلہ سماجی رکاوٹیں نہیں بلکہ مرد کی طاقت اور اختیار ہے۔ عورت کی محبت اور جسم اس کے کنٹرول میں ہیں۔ واجِدہ تبسم یہاں یہ دکھاتی ہیں کہ اخلاقیات پاکیزگی یا اعلیٰ اقدار کا نام نہیں بلکہ یہ عورت پر جبر اور کنٹرول کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

جدید اُردو افسانہ نگاروں میں خالدہ حسین اور نیّر مسعود عورت کی داخلی دنیا کو ایک نئے اسلوب میں دریافت کرتے ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں نسوانی تجربہ خاموش، گہرا اور نفسیاتی سطح پر مرتکز ہے ان کے ہاں مزاحمت زیادہ تر داخلی شعور کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ خالدہ حسین کی تحریروں میں عورت کی داخلی کیفیات، اس کے وجود سے وابستہ بنیادی سوالات اور معاشرتی جبر کے خلاف بیانیاتی مزاحمت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی تحریریں عورت کے احساسات، تجربات اور شناخت کو اہمیت دیتی ہیں اور عورت کی اپنی نظر سے اس کی زندگی اور مسائل کو بیان کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں عورت کی نفسیاتی دنیا، خود شناسی، سماجی پابندیوں اور مزاحمت کو نفسیاتی اور علامتی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت صرف سماجی کردار نہیں بلکہ اپنے اندر سے محسوس ہونے والے تناؤ، یادداشت اور شناخت کو تلاش کرتی ہیں جیسے "مصروف عورت" جیسے افسانے میں کردار اپنی سوچ، جذبات اور زندگی کے پیچیدہ تجربات کو بیان کرتی ہے اور یہ سماجی توقعات سے اپنے وجود کی تلاش کا عمل ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کے اندر کی دنیا اور اس

کے مزاحمتی جذبات واضح طور پر جھلکتے ہیں جہاں وہ اپنے دائرے، خود شناسی اور اپنی جگہ تلاش کرتی ہے۔ خالدہ حسین کی تحریریں عورت کی نفسیاتی اور سماجی مزاحمت کو براہِ راست دکھاتی ہیں۔ وہ "مصروف عورت" میں لکھتی ہیں

> "میرے گھر میں ایک خاموش تاریک کمرہ ہے۔ اس کی دیواروں میں نیچے سے اوپر تک طاق بنے ہیں۔ اور ان سب میں وہ چہرے دھرے ہیں جنہیں میں ایک ایک کر کے پہنتی ہوں۔ دن کے مختلف حصوں میں اپنے کام نمٹاتی چلی جاتی ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ ہر کام کے لئے مجھے مناسب "پر سونا" استعمال کرنا پڑتا ہے۔ بس میں ایک کے بعد ایک "پر سونا" پہن کر تمام کام کرتی چلی جاتی ہوں۔ کسی فلم کے فاسٹ موشن کی طرح۔ آپ پوچھیں گے آخر ان کاموں کے نپٹانے میں اتنی عجلت کیوں؟"(۱۴)

یہ عورت کی داخلی دنیا اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے۔ کردار ایک تاریک اور خاموش کمرے میں اپنے احساسات اور جذبات کے مختلف "چہروں" کو پہنتی ہے اور دن بھر کے کام اسی روپ میں انجام دیتی ہے۔ یہ عمل اس کی داخلی مزاحمت اور خود کی حفاظت کا طریقہ ہے جس میں بیرونی دنیا کے دباؤ یا سماجی توقعات کا اثر نظر آتا ہے۔ خالدہ حسین کے اسلوب کے مطابق یہاں مزاحمت براہ راست ظاہر نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی اور داخلی شعور کی صورت میں موجود ہے۔ کردار کی روزمرہ کی مصروفیت اور "پر سونا" پہننے کا عمل اس کی داخلی جدوجہد اور وجودی سوالات کی علامت ہے۔

نیر مسعود کے ہاں علامت اور فضا کے ذریعے عورت کی داخلی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح کہانی زیادہ بامعنی اور اثر انگیز بن جاتی ہے۔ نیر مسعود اور خالدہ حسین کے افسانوں میں عورت کا مسئلہ صرف سماجی جبر نہیں بلکہ وجودی تنہائی اور شناخت کی تلاش بھی ہے۔ جدید افسانہ نسوانی بیانیے کو ظاہری تصادم سے ہٹا کر باطن کی پیچیدگیوں تک لے جاتا ہے۔ جو نو آبادیاتی اثرات اور جبر کے خلاف مزاحمت کا موثر طریقہ ہے۔ نیر مسعود کا بیانیہ نسوانی تجربے پر نہیں بلکہ انسانی وجود، یادداشت، بے یقینی اور معنی کی تلاش پر مرتکز ہے۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں عورت کا تجربہ براہِ راست مرکز نہیں بھی ہوتا لیکن ان کی کہانیاں انسانی اندرونی کیفیت، احساس، یاد اور علامتی تضادات کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ان کے مشہور افسانوں میں "عطرِ کافور"، "طاؤس چمن کی مینا" اور دیگر بیانیات میں کردار اپنی یادوں، خودی اور معنی کی تلاش میں الجھتے ہیں جو ایک طرح سے اندرونی مزاحمت اور وجودی سوالات کو اٹھاتے ہیں۔ وہ ہر کردار کے اندر چھپے خیالات اور احساسات کو اشاروں سے سامنے لاتے ہیں۔ نیر مسعود کے افسانے انسان کے اندرونی سوالات، یادداشت اور معنی کی تلاش کو موثر انداز سے پیش کرتے ہیں۔ نیر مسعود "عطر کافور" میں لکھتے ہیں:

> "اس وقت مجھے سائبان کے نیچے رہ رہ کر ابھرتی اور دیتی ہوئی خوشبوؤں کا احساس ہوا کبھی ایک خوشبو بھرتی اور دوسری خوشبو اٹھ کر اسے دبالیتی کبھی کئی خوشبو میں مل کر ایک ہو جاتیں، پھر منتشر ہوتیں، پھر ایک ہو جاتیں، ان خوشبوؤں سے طرح طرح کے رنگوں اور آوازوں کا خیال آتا تھا اور ان رنگوں اور آوازوں سے ماہ رخ سلطان کی بہنوں کا خیال آتا تھا جو اب شاید پھر آتش دانوں والے

کمرے میں جمع ہو گئی تھیں۔ میں نے ڈبے کو ہاتھ میں اٹھالیا اور وہ مجھے خوشبوؤں
سے جھنجھناتا ہوا محسوس ہوا۔"(۱۵)

نیر مسعود خوشبو کو عورت کی یاد اور اس کے وجود کو علامتی طور پر پیش کرتے ہیں۔ خوشبوؤں کا آنا جانا اس بات کا اظہار ہے کہ عورت کی شخصیت دبی اور بکھری ہوئی ہے اس کی شناخت واضح نہیں ہے۔ "ماہ رخ سلطان" کی بہنیں ایسی عورتوں کی نمائندگی کرتی ہیں جو خاموش ہیں مگر مکمل طور پر غائب نہیں۔ نیر مسعود بتاتے ہیں کہ عورت مابعد نو آبادیاتی سماج میں بغیر بولے بھی اپنی موجودگی اور مزاحمت ظاہر کرتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیہ جامد نظریے کا پابند نہیں بلکہ اُردو افسانے میں عورت کو ایک زندہ، باخبر اور متحرک حقیقت کے طور پر سامنے پیش کرتا ہے جہاں اس کی زندگی کے مسائل جنس، تاریخ اور طاقت کے باہمی تعلق اور تصادم سے تشکیل پاتے ہیں۔ اگرچہ یہ افسانے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں لیکن ان سب کے پس منظر میں ایک مشترک فکری شعور کارفرما ہے جبکہ ہر کہانی کا اپنا منفرد زاویہ نظر ہوتا ہے۔

اُردو افسانوں میں عورت کے تجربات اکثر جبر، خاموشی اور مزاحمت کے تناظر میں سامنے آتے ہیں جہاں وہ ایسے سماجی اور تاریخی نظاموں کا سامنا کرتی ہے خواہ وہ کسی بھی عہد یا معاشرے سے تعلق رکھتے ہوں۔ انہوں نے عورت کے جسم، خواہشات اور اظہار کی آزادی پر مختلف طریقوں سے پابندیاں عائد کیں۔ یہ صورتحال واضح اشارہ کرتی ہے کہ نو آبادیاتی اور پدر شاہی ڈھانچے عورت کی زندگی پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہی مشترک تجربہ نسوانی بیانیے کو ایک اجتماعی شعور عطا کرتا ہے جس کے ذریعے فرد کا ذاتی دکھ وسیع تر سماجی سوال میں تبدیل ہو جاتا ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہر عورت کا تجربہ اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے جو اس کی تاریخ، طبقاتی پس منظر اور نفسیاتی کیفیت سے جڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض افسانوں میں مزاحمت خاموش اور باطنی سطح پر ہوتی ہے جبکہ بعض میں یہ نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اُردو افسانہ نسوانی فکر کو نظری مباحث تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے انسانی تجربے کی ٹھوس اور زندہ صورتوں میں پیش کرتا ہے اور اسی مشترک شعور اور انفرادی اظہار کے امتزاج میں نسوانی بیانیے کی اصل قوت پنہاں ہے۔

اُردو افسانہ جمالیاتی اظہار کے ساتھ ایک فعال فکری اور سماجی میدان ہے جہاں عورت مزاحمت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ افسانے میں عورت صرف "موضوع" نہیں بلکہ ایک فعال کردار کے طور پر موجود ہوتی ہے جو اپنی شناخت، جسم اور خواہشات کے ذریعے مزاحمت کو عملی شکل دیتی ہے۔ یہ مزاحمت کبھی خاموش انکار اور کبھی بیانیاتی اور کبھی علامتی شکل اختیار کرتی ہے اور یہ عورت کو مظلوم یا متاثرہ شخصیت کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ اسے ایک باشعور، مضبوط سوچ رکھنے والی اور کہانی کا رخ بدلنے کی صلاحیت رکھنے والی بااختیار شخصیت کے طور پر دکھاتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی تناظر میں یہ نسوانی مزاحمت ایک موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے جو سماجی اور تاریخی جبر کے دائرے میں عورت کی آواز کو ابھارتی ہے۔ مغربی فیمینزم (Western feminism) کے نظریات ہر معاشرتی اور ثقافتی سیاق میں یکساں لاگو نہیں کیے جاسکتے کیونکہ غیر مغربی عورت کی زندگی اور تجربات اتنے متنوع اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ انہیں مغربی نظریاتی ڈھانچے میں مکمل طور پر سمویا نہیں جاسکتا۔ اس میں مذہب، طبقہ، تاریخ اور استعمار کے پیچیدہ حالات شامل ہیں۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے مقامی نسوانی تنقید ضروری ہے جو اُردو ادب اور برصغیر کی تاریخی و سماجی حقیقتوں کے تناظر میں عورت کے تجربات کو سمجھ سکے۔

یہ تنقیدی زاویہ افسانے کی بصیرت کو بڑھاتا ہے اور مابعد نو آبادیاتی نسوانی بیانیوں کو معتبر اور وسیع بناتا ہے کیوں کہ یہ مقامی مسائل اور شناختی کشمکش کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ اس تحقیق کی روشنی میں سفارش کی جاتی ہے کہ اُردو نسوانی بیانیے کو روایتی اور تاریخی مفروضات سے آزاد ہو کر دوبارہ پڑھا جائے تاکہ عورت کے کثیر الجہتی تجربات سامنے آئیں۔ مابعد نو آبادیاتی تنقید میں صنفی پہلو کو مرکزیت دینا ضروری ہے تاکہ عورت کی داخلی اور خارجی مزاحمت اور اس کے وجودی و سماجی سوالات ایک جامع اور گہرے تناظر میں سمجھے جا سکیں۔ یہ تجدید نہ صرف ادبی فہم اور افادیت کو بڑھاتی ہے بلکہ معاشرتی اہمیت کے حوالے سے بھی عورت کے کردار، بیانیہ اور شناخت کو دونوں زاویوں یعنی معاصر اور تاریخی حوالے سے پہچاننے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔ یہ مطالعہ نہ صرف ادب کی فکری معیار کو بڑھاتا ہے بلکہ نسوانی بیانیوں کو سماجی اور ثقافتی مباحث میں فعال حصہ ڈالنے کا موقع بھی دیتا ہے۔

حوالہ جات

1. George Ritzer, Sociological theory, Eighth Edition, The McGraw Hill Companies, P:77

۲۔ شہزاد منظر، جدید افسانہ اور عصری آگہی، مشمولہ: جدید اُردو افسانہ، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۸۲

۳۔ انیس بارون، فیمینزم اور پاکستانی عورت، (مشمولہ)، فیمنزم اور ہم، مرتبہ: فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، جون ۲۰۰۵، ص:۱۳

۴۔ ڈاکٹر ماجد ممتاز، ڈاکٹر طیبہ بشیر، ڈاکٹر تہمینہ ممتاز، گمان، (مشمولہ)، فیمنزم اور اُردو ادب: خواتین ادیبوں کا کردار، فیڈرل اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد نمبر: ۸، شمارہ نمبر ۱، ۲۰۲۵ء، ص ۱۸۵

5. Spivak, G. C. "Can the subaltern speak?", In C. Nelson & L. Grossberg (Eds.), Marxism and the interpretation of culture, Urbana, Macmillan Education, Basingstoke.1988, p :271-313
6. Mohanty, C. T. (2003). Feminism without borders: Decolonizing theory, practicing solidarity. Duke University Press, London, 2003, pp 21
7. Mohit Nimariya, "A feminist study of the short stories of Saadat Hasan Manto and Ismat Chughtai", International Journal of Humanities and Arts, Baba Mastnath University, Haryana, Inda, 2024, 6(1): p:102-105 DOI: https://doi.org/10.33545/26647699.2024.v6.i1b.76

۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو فکشن کی مختصر تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص:۱۷۴

۹۔ فہمیدہ ریاض، "ادب کی نسائی رد تشکیل"، مشمولہ: اُردو ادب میں عورت کا تصور مرد کی نظر میں، بادشاہ منیر بخاری، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص:۱۴۲

10. Mohit Nimariya, "A feminist study of the short stories of Saadat Hasan Manto and Ismat Chughtai", International Journal of Humanities and Arts, Baba Mastnath University, Haryana, Inda, 2024, 6(1): pp102-105 DOI: https://doi.org/10.33545/26647699.2024.v6.i1b.76

۱۱۔ عصمت چغتائی، عصمت چغتائی کے بہترین افسانے، وفاق پریس، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص:۲۵۸

۱۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک پورٹ پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی، ۱۹۹۳ء، ص:۸۸-۸۹

۱۳۔ واجدہ تبسم، واجدہ تبسم کے شاہکار افسانے، رحمن بک ڈپو، ص:۹۸

۱۴۔ خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، مصروف عورت، سنگ میل پبلکیشنز لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۳۶۰

۱۵۔ نیر مسعود، مجموعہ سیمیا: عطرِ کافور،، مکتبہ جامعہ، لکھنؤ، ۲۰۰۲، ص: ۴۷

Reference Roman Urdu Script:

1. George Ritzer, Sociological theory, Eighth Edition, The McGraw Hill Companies, P.77
2. Shehzad Manzar, "Jadeed Afsana aur Asri Aagahi", Mashmoola: Jadeed Urdu Afsana, Manzar Publications, Karachi, 1982, p. 82
3. Anis Baron, "Feminism aur Pakistani Aurat", Mashmoola: Feminism aur Hum, Murattaba: Fatima Hasan, Wada Kitab Ghar, Karachi, June 2005, p. 13
4. Dr. Majid Mumtaz, Dr. Taiba Basheer, Dr. Tehmina Mumtaz, "Guman", Mashmoola: Feminism aur Urdu Adab: Khawateen Adeebon ka Kirdar, Federal Urdu University, Islamabad, Volume 8, Issue 1, 2025, p. 185
5. Spivak, G. C. “Can the Subaltern Speak?”, in C. Nelson & L. Grossberg (Eds.), Marxism and the Interpretation of Culture, Urbana, Macmillan Education, Basingstoke, 1988, pp. 271-313
6. Mohanty, C. T. (2003). Feminism Without Borders: Decolonizing Theory, Practicing Solidarity. Duke University Press, London, 2003, pp. 21
7. Mohit Nimariya, “A Feminist Study of the Short Stories of Saadat Hasan Manto and Ismat Chughtai”, International Journal of Humanities and Arts, Baba Mastnath University, Haryana, India, 2024, 6(1): pp. 102-105, DOI: https://doi.org/10.33545/26647699.2024.v6.i1b.76
8. Farman Fatah Puri, Dr., Urdu Fiction ki Mukhtasar Tareekh, Al-Waqar Publications, Lahore, 2020, p. 174
9. Fahmida Riaz, "Adab ki Nisai Rad Taskeel", Mashmoola: Urdu Adab mein Aurat ka Tasawwur Mard ki Nazar Mein, Badshah Munir Bukhari, Wada Kitab Ghar, Karachi, 2006, p. 142
10. Mohit Nimariya, A feminist study of the short stories of Saadat Hasan Manto and Ismat Chughtai”, International Journal of Humanities and Arts, Baba Mastnath University, Haryana, Inda, 2024, 6(1): pp102-105 DOI: https://doi.org/10.33545/26647699.2024.v6.i1b.76
11. Ismat Chughtai, Ismat Chughtai ke Behtareen Afsanay, Wifaq Press, Lahore, 1979, p. 258
12. Mumtaz Ahmed Khan, Dr., "Urdu Novel ke Badalte Tanazur", Wellcome Book Port Private Limited, Karachi, July 1993, pp. 88-89
13. Wajida Tabassum, Wajida Tabassum ke Shahkar Afsanay, Rehman Book Depot, p. 98
14. Khalida Hussain, "Majmua Khalida Hussain: Masroof Aurat", Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2008, p. 360
15. Neer Masood, Majmua Simia: Itr-e-Kafoor, Maktaba Jamia, Lucknow, 2002, p. 47